

نبی اکرم

ﷺ

کام مقصد لعینیت

ڈاکٹر اسرار احمد



مکتبہ مرکزی انجمن تحفہ القرآن لاہور

نام کتاب ————— نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت

بار اول تا بار پنجم (۱۹۷۸ء تا ۲۰۰۱ء) ————— ۲۷۵۰۰

بار ششم (جنوری ۲۰۰۲ء) ————— ۱۱۰۰

ناشر ————— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ————— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۳-۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ————— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت (اشاعت خاص) ————— ۳۶ روپے

نبی اکرم

ﷺ

کا مقصد بعثت

اور

انقلابِ نبویؐ
کا اساسی منہاج

از

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب

تقدیم طبع اول .. صفحہ ۴

تقدیم طبع چہارم ... صفحہ ۵

★ مقالہ اولیٰ ★

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت

● تمہید صفحہ ۹

● بعثتِ انبیاء کا اساسی مقصد ۱۰

● بعثتِ محمدؐ کی اتمامی و تکمیلی شان ۲۶

★ مقالہ ثانیہ ★

انقبِ الانبویٰ کا اساسی منہاج

صفحہ — ۵۲

تفہیم طبعِ اول

زیر نظر کتابچہ میرے دو مقالوں پر مشتمل ہے :-

پہلا مقالہ ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت: قرآن مجید کی روشنی میں“ مرکزی اخبارِ مہتمم القرآن لاہور کی دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں پیش کیا گیا تھا جو جناح (طافن) ہال لاہور میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء کی صبح کو منعقد ہوا جن اتفاق سے اس روز ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ کی تاریخ تھی اور اس طرح مقالے کے موضوع کے ساتھ ایک حسین مناسبت پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں یہ مقالہ دو قسطوں میں ماہنامہ ”مِثاق“ لاہور کی اکتوبر اور دسمبر ۷۵ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔

دوسرا مقالہ ”انقلابِ نبویؐ کا اساسی مہاج“ تحریری صورت میں تو مارچ ۷۵ء میں ”شام ہمدرد“ لاہور کی تقریب میں پیش کیا گیا تھا اور جن اتفاق سے اس روز بھی قمری تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ ہی تھی۔ البتہ اس عنوان سے ایک تقریر اولاً انجن خدام القرآن کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس کے آخری اجلاس ہی میں کی گئی تھی جو ۲۳ مارچ ۷۵ء کی شام کو جناح ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ بعد ازاں ایک جانب تو یہ مقالہ ماہنامہ ”مِثاق“ لاہور کی اشاعت بابت اپریل ۷۵ء میں شائع ہوا اور دوسری جانب اسے ایک اصلاحی نصاب نے چھ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کے مفت تقسیم کیا۔ اب یہ دونوں تحریریں یکجا پیش خدمت ہیں!

اللہ تعالیٰ اسے میرے حق میں بھی توشہِ آفرت بنائے اور اس کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے زندگیاں وقف کر دینے کی وہ ”آرزو پیدا فرمائے جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے جسدِ حسرت و یاس فرمایا تھا کہ: ع
آرزوِ اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں اور جو جائے تو مرجاتی ہے یا زہتی ہے خام!

اس لیے کہ آنحضرتؐ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل کے لیے جان و مال کھپانا ہی آپ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا علامہ مرحوم نے کہ:

کی محمدؐ سے وفات نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چہرے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لاہور ۷ مارچ ۱۹۷۸ء _____ خاکسار: اسرار احمد عفی عنہ

تقدیم طبع چہارم

الحمد للہ کہ اس کتابچے کی چوتھی طباعت کے موقع پر نظر ثانی کی فرصت بھی میسر آگئی، اور کتابت بھی از سر نو کرائی گئی۔ گویا اب یہ کتابچہ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات سے پہلے سے بہتر صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نظر ثانی کے دوران بار بار قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر و ثناء کے جذبات پوری شدت کے ساتھ ابھرے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اب سے بارہ تیرہ سال قبل مجھ ایسے کم علم اور بے بضاعت انسان کے قلم سے یہ دو مقالے تحریر کرا دیئے، جو نہ صرف یہ کہ سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے صحیح فہم کے لیے بمنزلہ تکلیف ہیں، اس لیے کہ ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی کی جدوجہد کا اصل ہدف بھی معین ہو جاتا ہے اور آپ کا اساسی منہج عمل بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان تمام تحریکوں کی اہم ترین اور انتہائی اساسی عملی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں جو مختلف مسلمان ممالک میں احیاء اسلام اور غلبہ دین کے عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔

یعنی اولاً: اس امر کا واضح تعین کہ احیاء اسلام اور غلبہ دین کی جدوجہد اسلام کے نظام فکرو عمل میں کس مرتبہ و مقام کی حامل ہے؟ اور توحید، معاد اور رسالت کے اساسی نظریات و معتقدات کے ساتھ اس کا علمی اور نظری ربط کیا ہے؟ اور ثانیاً: اس امر کی وضاحت کہ اس عظیم جدوجہد کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ اور اسلامی انقلاب کے مرحلہ اولیٰ یعنی مردان کار کی تیاری کے لیے دعوت، تزکیہ، اور تعلیم کا قرآنی اور نبوی منہاج کیا ہے؟۔

راقم الحروف کے واقفان حال اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انجمن خدام القرآن، اور تنظیم اسلامی کی اکثر و بیشتر مطبوعات راقم کی ان تقاریر یا درس پر مشتمل ہیں جنہیں

کے ضعف کے باعث، یا ذرا سی بددلی اور مایوسی یا اپنی کوشش اور محنت کے حبِ نشانہ تاجِ برآمد نہ ہوتے دیکھ کر سعی و جہد ہی سے دستکش ہو جاتے اور اپنی بے عملی اور تعطل کے لیے علم اور تحقیق کے نام کو بٹ لگاتے ہوئے کسی اٹلی سیدھی دلیل کا سہارا لے لے۔ ————— اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ آیہ مبارکہ ”هُوَ الَّذِي أَنْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ“ پر جو جامع اور مدلل تحریر راقم کے قلم سے آج سے تیرہ سال قبل صادر ہو گئی تھی، میں اسے سراسر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر اور ایک خاص وقت کی کیفیات اور خصوصی جذبے کا مہر ہونے منت سمجھتا ہوں۔ ————— اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے نہ صرف ان لوگوں کے حق میں سرمہ چشم بنادے جو اللہ تعالیٰ اور رسول کے ساتھ خلوص و اخلاص کا رشتہ رکھنے کے باوجود تاحال دین کے حرک کی تصور سے نا آشنا ہیں اور محض جامد مذہبیت پر تنکیہ کیے ہوئے ہیں، بلکہ اُن بہت سے پُرانے راہروانِ راہِ حق کو بھی اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کا ذریعہ بنادے جو کسی شخص یا جماعت کے طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہونے کے باعث اقامتِ دین کی جہد و جہد ہی سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، اور اب مختلف گوشہ ہائے عافیت میں پناہ لیے ہوئے ہیں، تاکہ یہ ”بھٹکے ہوئے راہی“ بھی دوبارہ ”سوئے صرم“ کا مرن ہو جائیں۔ ————— وَمَا ذَاكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ!

مقالہ ثانیہ یعنی ”انقلاب نبویؐ کا اساسی منہاج“ توجہ کو اسلامی انقلاب کے مرحلہ اولیٰ پر مرکوز کر کے اس اندیشے کا سد باب کرتا ہے کہ کوئی طاقتور جذبہ عمل انسان کی اس طبعی کمزوری کی بنا پر جو ”خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَجٍ“ میں بیان ہوئی ہے، بنیادی احکام اور ابتدائی لوازم (PRE-REQUISITES) کو نظر انداز کر کے اپنی تیز روی اور عجلت پسندی کے باعث

۱۔ ”بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوتے صرم لے چل۔ اس شہر کے خور کو پھر وسعت صحرا دے! اقبال

۷۷ سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاءِ: ۳۷- ترجمہ ”انسان کی خلقت میں عجلت پسندی شامل ہے۔“

اپنے آپ کو غواہی ناکامی کا متحذ بنالے۔۔۔۔۔ موضوع اور عنوان کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ اس مقالے میں 'انقلاب نبوی' کے لقیہ مراحل پیشگو خارج از بحث تھی، لیکن الحمد للہ کہ اب ان جملہ مراحل پر راقم کی جامع تالیف 'منہج انقلاب نبوی' منصفہ شہود پر پہنچی ہے جس سے اسلامی انقلاب کے تمام مراحل از ابتدا تا انتہا واضح اور برہن ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ **فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْبَیِّنَاتُ**

جن حضرات کو اس کتابچے کے مطالعے سے کوئی 'رہنمائی' میسر آئے، اُن سے استدعا ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس راہ پر ثبات اور استقامت عطا فرمائے جس کی نشاندہی اس کتابچے میں کی گئی ہے۔۔۔۔۔ اور میں ان کے حق میں دُعا کرتا رہوں گا کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ

چسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؐ بھی عطا کر!

اگر اللہ نے انہیں اس راہ کی صداقت اور حقانیت پر ذہنی اطمینان اور قلبی انشراح عطا فرمایا ہے تو اس پر عملاً گامزن ہونے کی ہمت اور توفیق بھی عطا فرمائے، واللہ الموفق والمستعان!

اس کتابچے پر نظر ثانی کے سلسلے میں جو تعاون قرآن اکیڈمی کے بزرگ استاد محترم حافظ احمد یلہ صاحب نے فرمایا اور جن مفید مشوروں سے نوازا، اُن کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر پیشکش کو شرف قبول عطا فرما کر اسے دین حق کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد کے سلسلے کی ایک مفید کڑی اور میرے حق میں توشعہ آخرت بنادے۔ آمین

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

نبی اکرم

ﷺ

کا مقصد بعثت

قرآن حکیم کی روشنی میں



تمہید

ہمارا ایمان ہے کہ سید ولد آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں
”خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ“ ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں ”اٰخِرُ الرُّسُلِ“ ہیں اور آپ پر نبوت
رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپ کی بعثت
کا مقصد مجملہ انبیاء و رسل کے مقصد بعثت سے مختلف نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ
آپ کی بعثت کے مقصد میں ایک انامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو جس سے نبیوں اور رسولوں
کی مقدس جماعت میں آپ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے
ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ از روئے قرآن حکیم بعثت انبیاء و رسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا
ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بعثت خاتم النبیین و اٰخِر الرسل میں آپ کے مقصد
بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

بعثت انبیاء

کا اساسی مقصد

ایمانیات ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں یعنی، توحید، معاد اور رسالت یا ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت، لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابل تقسیم وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیت ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالم وجود اور سلسلہ کون و مکاں جو ماحدہ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا بلکہ حادث بھی ہے اور بالکلیہ وفاقی بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اسے اللہ کہہ لیا جاتے یا الرحمن کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور تمام صفات کمال سے بتمام و کمال متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور یکتا ہے نہ کوئی اس کی ذات میں

لے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (التقص: ۸۸)

عہ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمن: ۲۶-۲۷)

ثہ قُلْ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں نہ اختیارات میں!

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ”بِالْحَقِّ“ اور ”إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى“ تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلہ تخلیق کا مرتبہ کمال ہے انسان جسے اس نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا، پھر اس میں اپنی رُوح میں سے چھوٹکا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرمادیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جملہ مراتب تنزل کا حاصل بھی قرار دیا جاسکتا ہے بقول حضرت بیدلؒ

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقرش آدمی

اے بہاؤِ مستی از قدرِ خود ہشیار باش!

اور ایک دوسرے پہلو سے پورے سلسلہ ارتقاء کا نقطہ عروج بھی!

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ

ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین

تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ

ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلیں

سَفِيلِينَ (سورة التین)

میں سب سے نچلا!

کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کُل زندگی نہیں بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس

ایمان بالآخرت

(i) قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ

لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (سورة الاضاح)

(ii) وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذَّلِيلِ وَكَرِهَ

تَكْبِيرًا ۝ (سورة بنی اسرائیل: آیت iii) وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدٌ ۝

(سورة الکہف: ۲۶)

لَهُ خَلَقَ اللَّهُ أَدَمَ عَلَىٰ صُورَتِهِ

اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔

الْحَدِيثُ: شَيْخُنْ عَنْ ابْنِ هَرِيرَةَ

کی کتاب حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدمہ یا اس کے سفر حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ۔ بقول علامہ اقبال مرحوم :-

تو اسے پیامہ امروز و فردا سے ناپ جاو دوں، پیہم دوں ہر دم جوانی زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا، مانند حجاب اس نیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کو نقل مکانی کا نام ہے جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالم برزخ جس کا آغاز موت کے فوراً بعد ہو جاتا ہے اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالم آخرت جس کا آغاز یوم قیامت سے ہو گا۔ بعثت بعد الموت، حشر و نشر حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ سب اسی ایمان بالآخرت کی تفصیل ہیں بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم :

وَاللّٰهُ لَتَمُوْنُنَّ كَمَا تَمُوْنُنَّ ثُمَّ لَتَبْعُنَّ كَمَا تَبْعُوْنَ ثُمَّ لَتَنَاسِبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
ثُمَّ لَنَجْزِيَنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوءِ سُوْرًا وَّ اِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا وَّ اُولٰٓئِكَ اَبَدًا
(ماخوذ از خطبات نبویؐ بحوالہ بیچ البلاغ)

(ترجمہ) خدا کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو، پھر تمہیں لازماً اٹھا لیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر یہ بدل کر رہے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا۔ اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے !

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط
غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم

پیدا کیا سلسلہ موت و حیات تاکہ جانچے نہیں کرکون ہے تم میں سے سب اچھے عمل کرنے والا۔

لَخَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورة الملك: ۲)

مل کر مبداء و معاد یا حیاتِ انسانی کی ابتدا و انتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان سے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کا تعین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآنی ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ (ترجمہ) ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی قسم کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ مبداء و معاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اس کے سفر کی منزل کون سی ہے۔ گویا بقولِ فانیؒ

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن

غربت جس کو اس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا بقولِ غالبؒ

رو میں ہے رخِ عمر کہاں دیکھیے تھے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعین کے محض بطن و فرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا سپیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بسر کر دیتا ہے۔ مطابق تمثیلِ قرآنی:

أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ

بھلا ایک جو چلے اونداھا اپنے منہ کے

وَجِهَةٍ ۖ أَهْدَىٰ ۖ أَمَنْ يَمْشِي

بل وہ سیدھی راہ پاتے یا وہ شخص جو چلے

سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

سیدھا ایک سیدھی راہ پر ہے

(سورۃ الملک: ۲۲)

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یا پھر اُس کی کیفیت اُس تپنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے حم و کرم پر ہو کر جہاں چاہے اُسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی:

فَكَانَ سَاخِرًا مِّنَ السَّمَاءِ

تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے پھر اُچک

فَتَخَطَفَهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوَىٰ

لیٹے ہیں اسے (مردارِ خور) پرندے

بِهَ الزَّيْطِ فِي مَكَانٍ یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی

سُحَيْبِی (سورۃ الحج : ۳۱) دور دراز مقام پر!

اور اس سے ”نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم“ کا نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و

شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے گویا لاادریت (AGNOSTICISM) اور ارتیابیت

(SCEPTICISM) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ

وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے، گویا:

ع ”ہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!“ لے

ایک اہم سوال | یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان
باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمان بالرسالت کے صحیح منطقی

رابطہ کے فہم و ادراک کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جائے
گایا بالفاظ دیگر محاسبۂ آخری کی اساسات کیا ہیں۔

مطالعہ قرآن حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اُسے ایک جملے میں تو اس طرح

ادا کیا جاسکتا ہے کہ

انسان اولاً اور اصلاً تو مستول ہے ان استعدادات فطریہ یا طائفۂ اصلیہ کی بنیاد

پر جو ہر انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں جیسے سمع و بصر عقل و شعور اور تفکر و اعتبار

یا لطیفۂ نفس، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح — اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان

لے شاد عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے قافی بدایہ فی نے اپنی منطقی انتہا تک بایں طور پہنچایا کہ

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

پر اتمامِ محبت کا اہتمام کیا ہے بذریعہ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثتِ انبیاء
ارسالِ رسل ————— لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے!

لطیفہ نفس انسان کے متذکرہ بالا لطائفِ ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین لطیفہ نفس ہے جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ

عالمِ خلق سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس کا رجحانِ اصلی عالمِ اسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعہ ”اَمَّا رَقِیُّ السَّوْءِ“ ہی کا طوفانِ موجزن ہے جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا ماکس نے، دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا اڈلر نے اور یہی ہے وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفہ روح اور بالکل دوسری انتہا پر ہے لطیفہ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب (وَكَفَّخَتْ فِيهِ مِنْ تَوْحِيٍّ) اور جس کا تعلق ہے

کلیۃً عالمِ امر سے (قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي) اور جس کا اصل رُخ ہے ”ع“ اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن! کے مصداق عالمِ بالا کی جانب، چنانچہ اس میں محبتِ الہی کا ایک جذبہ اور لُحْظاءِ رَبِّ کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سلگتا ہے بقول علامہ اقبال مرحوم :-

کبھی اے حقیقتِ منتظرِ نظر آلباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں!

البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے بعض ارباب دانش نے شعلہ ملکوتی (DIVINE SPARK) سے تعبیر کیا ہے۔

خیر و شر کا داخلی محرکہ گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ”انسان عالمِ اصغر ہے“ اور واقعہً انسان کے باطن میں سب ہی کچھ موجود ہے چنانچہ

بدی کے لپٹ ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی۔ اور ان ہی کے مابین ایک شدید کشمکش اور رُخِ مستقل جنگ جاری ہے انسان کی باطنی شخصیت کے وسیع و عریض میدان کا زار میں!

لیکن اس معرکہ خیز و شریش خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تنگ

مسئولیت کی اساساتِ اصلییہ

نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نوازا اور بہت سی قوتوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے، چنانچہ اس کی شخصیت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفہ نفس' بھی ایک جانب مسلح ہے استعداداتِ سماعت و بصارت اور قوائے تعقل و تفکر سے اور دوسری جانب مسلح ہے ایک اخلاقی حس سے جو تمیز کرتی ہے خیر اور شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو۔ بنا بریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورتِ نفسِ لوامہ!

بخوانے آیاتِ قرآنی:

۱- اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ثُمَّ بَتَّلْنَاهُ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا

ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفے سے تاکہ آزمائیں اسے، چنانچہ بنادیا ہم نے اسے سُننے والا، دیکھنے والا!

(سورۃ الدھر: ۲)

۲- وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَالْتَمَتْهَا فَجَوَّهَا وَتَقَوَّاهَا

اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کر اسے بنایا ٹھیک ٹھیک، پھر دو لیت کر دی

(سورۃ الشمس: ۷-۸)

اس میں سوچہ بدی اور نیکی کی!

۳- لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیْمَةِ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ

نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں! (بلکہ) قسم کھاتا ہوں میں نفسِ ملامت گر کی!

(سورۃ القیمة: ۱-۲)

۴۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ
بَصِيرَةٌ ۖ وَلَئِن لَّمْ يَظْهَرِ لَهُ
بَلْغَاءُ ۖ لَظْهَرَ ۚ

(سورة الفیہ: ۱۴-۱۵)

بنابریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کے قابل اور اس کا مستحق ایسا
تک کہ عدالت اُخروی میں نفس کو اپنی جوابدہی خود ہی کرنی ہوگی اور اپنا محاسبہ خود ہی جھگٹنا
(FACE) کرنا ہوگا۔ لہذا قرآنی:

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ
تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّى
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ -
جس دن آئے گا ہر نفس مافعت
کرتے ہوئے اپنی جانب سے۔
اور پورا پورا اصلہ مل جائے گا ہر نفس

(سورة اہل: ۱۱۱) کو اپنے کیے کا!

اور نہ کوئی نفس دوسرے نفس کے کام آسکے گا، نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش
یافتہ قبول ہوگا، نہ اسے کسی طرف سے مدد ملی سکے گی۔ لہذا قرآنی:

وَأَنفَعُوا يَوْمَ لَا تُجْزَىٰ نَفْسٌ
عَن نَّفْسٍ سَّيِّئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ ۖ وَلَا يُوْخَذُ مِنْهَا
عَدْلٌ ۚ وَلَا هُمْ يَصْرَفُونَ ۝
اور دُور اس دن سے جب نہ کام آسکے گا
کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے بچھبھی۔
اور نہ قبول کی جائے گی اس کی جانب سے
کوئی سفارش اور نہ قبول ہوگا کوئی فدیہ

(سورة البقرة: ۴۸) اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہوگی!

اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انسان میں ایک اور جوہر نایاب
و دلچسپ فرمادیا جس میں معرفت ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور مجاہدات
کوئی بھی منکس ہیں ہماری مراد ہے 'لطیفہ قلب' سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے
مانند جس میں عالمِ اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے گویا اگر لطیفہ نفس قوائے سمیع و بصیر اور

لطیفہ قلب

تفعل و تفکر سے مسلح ہے جو اساس ہیں جملہ علوم مادی و نظری کی تو لطیفہ قلب مسلح ہے ان قوائے
تفہیم و تفقہ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائق کو نئی اور معارف لذیہ کا بقول شاعر

سہ بینی اندر دل علوم انبیا۔ بے کتاب و بے معید و اوستا!

اور سہ صد کتاب و صد ورق در ناک کن روتے دل را جانب دلدار کن!

اور سہ در گنزد ہدایہ تو ان یافتہ ارا در آئینہ دل ہیں کہ کتاب بے از نیست!

الغرض لطیفہ قلب کے ودیعت کیے جانے کے بعد انسان کی مسولیت پر آخری مہر
تصدیق ثبت ہو جاتی ہے لہذا قرآنی :

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ یَقِینًا کَانَ أَمَّکَہ اور دل ہر ایک کے

کُلُّ أَوَّلَئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُولًا ۝ بارے میں پرسش ہو کر رہے گی!

(سورۃ بنی اسرائیل ۳۶)

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان

لے اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ خود کلام نبوت میں 'قلب' کے لیے اسی قسم کے
الفاظ وارد ہوئے ہیں مثلاً اُس مشہور حدیث میں جس کی رو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ لَتَصْدَأُ کَمَا یَدُل جی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے

یَصْدَأُ الْحَدِیدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آجاتا ہے!

جس پر صحابہ کرام نے بالکل صحیح سوال کیا کہ:

فَمَا جَلَاءُ مَا یَا رَسُولَ اللّٰہِ حضور! پھر انہیں متقل کیسے کیا جاتے؟

جواباً ارشاد ہوا:

کَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی

وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ کثرت کے ساتھ تلاوت!

فطری استعدادات کو بے کار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کر لیں، لہجوائے آیت قرآنی:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ

ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں

بِهَآؤْ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ

اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے

بِهَآؤْ لَهُمْ اُذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ

نہیں اور کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں

بِهَآؤْ لَكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ

وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے

اَصَلُّ ط (سورۃ الاعراف: ۱۷۹)

بھی گئے گزرے!

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیت کے باطنی میدان کا زار میں جاری ہے، اس کو

خیر و شر کے خارجی داعیات

تقویت پہنچانے والے کچھ داعیات خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدنِ پیش

تہذیب نے پھر اپنے دزدوں کو ابھارا

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

لیکن یہ بات ابھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیت داخلی کشاکش ہی کی

ہے، خارجی داعیات محض تقویت کے موجب ہو سکتے ہیں خواہ وہ خیر کی جانب تشویق و ترغیب

پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تھریں و تھریں پر چنا چھہ کسی داعی شرحتی کہ ابلیس لعین و شیطان رحیم

ملک کو یہ قوت و اختیار ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر برائی پر مائل کر سکے، لہجوائے آیت قرآنی:

اِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ

جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ

سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اشَاءَ

زور نہیں! سوائے اس کے جس نے

مِنَ الْغَوِيْنَ

خود ہی تیری پیروی کی جہکے ہوں

میں سے!

(سورۃ الحجر: ۴۲)

اسے (ابلیس کو) کوئی اختیار حاصل نہیں

اِنَّهٗ لَيْسَ لَكَ سُلْطَانٌ

ہے ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلَى

رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝

رَبِّ پر بھروسہ کرتے ہیں!

(سورۃ النحل : ۹۹)

اور نہ ہی کسی داعیِ خیر حتیٰ کہ سید الاولین والآخرین، خاتم النبیین و آخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے؛ از روئے آیت قرآنی:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ

(اے نبی!)، تو راہ پر نہیں لاسکتا جسے

وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

چاہے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے

(سورۃ القصص : ۵۶) ہدایت دیتا ہے۔

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں یعنی ابلیس اور اس کی ضلی و معنوی ذریت انسانوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے کہ:

إِنَّهُ يَرْسُكُم مَّوَقِعِيْلُهُ

وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو

مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ

اور اس کے ہم جنس بھی، جہاں سے

(سورۃ الاعراف : ۲۷) تم ان کو نہیں دیکھتے!

اور حدیث نبوی میں بھی تصریح ہے کہ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ! (صحیح بخاری) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا ہے، لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دورانِ اصحابِ خیر اور اہلِ حق کے لیے تقویت و تثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں اور جس طرح شیاطین جن و انس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک و اشتغال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی روحِ ملکوتی میں نشاط و اہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکہِ حق و باطل کے دورانِ اہلِ حق کے قلبی سکون و اطمینان اور عملی ثبات و استمعال کا سبب بنتے ہیں لہٰذا آیت قرآنی:

وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر
اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ نکالے
تہیں اندھیروں سے اُجالے میں!

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ
وَمَلَائِكَةُ يُخَيِّرُكُمْ مِّنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(سورة الاحزاب: ۴۳)

جب وحی (کے ذریعے حکم، فرما رہا تھا
تیرا رب فرشتوں کو کہ میں تمہارے
ساتھ مہل پس دلوں کو جمانے کو ہا بل بیان کے!
لے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی
ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے۔
ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ
خائف ہو نہ غمگین اور خوشخبری حاصل
کر و اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ
کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی
اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور

۲- اِذْ يُوحِي رُؤْيَاكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
اَنۡیۡ مَعَكُمْ فَتُنۡتَوُا۟ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ط

(سورة الانفال: ۱۲)

۳- اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبَّنَا اللّٰهُ
تَعَالٰی سَمِعُوۡا نَزَلَ عَلَیْہِمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحْزَنُوۡا
وَابَشِّرُوۡا بِالْجَنَّةِ
الَّتِیۡ كُنْتُمْ تُوعَدُوۡنَ ہ نَحْنُ
اَوَّلِیَاکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا
وَفِی الْاٰخِرَةِ ط

آفرت میں بھی!

(سورة الحٰجۃ: ۳۱-۳۲)

اتمامِ حجت اور قطعِ عذر
اب ہم موضوعِ زیرِ بحث کی بحثِ اول کے آخری نقطے تک
پہنچ گئے ہیں جو یہ ہے کہ جس طرح انسان کے صلِ داخلی

داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائفِ نفس و روح، لیکن اصلِ حجتِ داخلی بنتی ہیں استعدادِ
سمع و بصر و نقل و فکر اور حسنِ اخلاقی اور تفقہِ قلبی جنہیں انسان کی مسولیت کی اساساتِ اصلیہ
کہا جاسکتا ہے اسی طرح اصلِ خارجی داعیانِ خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس
اور اس کی ذریتِ صلی و معنوی لیکن اس ضمن میں اتمامِ حجت ہوتا ہے اجرائے وحی، تنزیلِ کتب

بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رسل سے جن کی حیثیت ہے حجتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرسالت !

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

۱- رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ
لَعَلَّآ يَكُونَنَّ لِلنَّاسِ عَلَى
اللَّهِ حُجَّةٌ مَّ بَعْدَ الرُّسُلِ كَانَ
اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا

(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے
والے اور خبردار کرنے والے تاکہ نہ
رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل
اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں۔ اور

(سورة النساء : ۱۶۵)

۲- يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ
رُسُوْلُنَا بِبَيِّنٰتٍ لَّكُمْ عَلٰى
فِتْنَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اِنْ تَقُوْلُوْا
مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ
فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيْرٌ مِّنْ ذِيْ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

اللہ تو ہے ہی زبردست اور کمالِ حکمت والا
اے اہل کتاب ! تمہارے پاس آگیا ہے
ہمارا رسول جو واضح کر رہا ہے تم پر
(ہماری ہدایت) اس کے باوجود
کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا
سلسلہ رسالت مبادا تم کہو کہ نہیں آیا
ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور

(سورة المائدة : ۱۹)

خبردار کرنے والا۔ تو اب آگیا ہے تمہارے

پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی !

گویا بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمامِ حجت اور قطعِ عذر
تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی
یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔

یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے
خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و

تحریریں اور تحریک و تشویق کی ہے اسی طرح نبوت و رسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت و تبلیغ کی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاح مبشرین و منذرین ہی کی ہے۔ جیسے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (سورۃ الکہف: ۵۶) اور وحی و کتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ، ذکر، ذکر، ذکر اور تذکرہ کے ہیں۔ جیسے:-

۱- اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ۚ
اِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

(یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے

محافظ و نگہبان! (سورۃ الحجر: ۹)

۲- طه ۝ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ
الْقُرْآنَ لِتَشْتَقِيَ ۝ اَلَمْ تَذْكُرْ
لِمَنْ يَنْحَشِي ۝

(اے نبی) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے
تو نہیں اتارا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ بلکہ
(اتارا اسے) صرف یاد دہانی کے طور پر

ان کے لیے جو ڈرتے ہوں! (سورۃ طہ: ۲۰-۲۱)

۳- كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝

نہیں! یہ ایک یاد دہانی ہے!

(سورۃ عبس: ۱۱)

۴- تَبٰرَكَ الَّذِي يَدْعُوْكَ لِيَخْلُقَ مَا يَشَاءُ
وَيُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ ۝

سُبْحَانَ الَّذِي يَدْعُوْكَ لِيَخْلُقَ مَا يَشَاءُ
وَيُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ ۝

کے لیے جو رجوع کرے!

(سورۃ ق: ۸)

۵- اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّمَنْ
كَانَ لَهُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ

اس میں یاد دہانی ہے اس کے لیے
جس کے پاس ہو دل (زندہ و بیدار)

وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ (سورۃ ق: ۳۷)

۶- فَذِكْرُنَا اِنَّمَا تَمْذَكِرُكَ
اَلَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝

تو (اے نبی) تم یاد دہانی کرائے جاؤ۔
تو ہاں کام تو میں یاد دہانی کراتا ہی ہے۔ ان

اَلَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝

(سورۃ الفاشیہ: ۲۱-۲۲) پر داروغہ تو ہو نہیں سکتا (ضرورتِ ہدایت پر لے آؤ!)

اور ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اصطلاح 'شہادت' کی ہے اور فرضِ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی الناس ہی ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھوائے آیاتِ قرآنی:

۱- اِنَّا ارْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُولًا
شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا
ارْسَلْنَا اِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا
(سورۃ الزلزلہ: ۱۵)

۲- لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيدًا
عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلٰی
النَّاسِ (سورۃ الحج: آخری آیت)

۳- فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ
اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ
عَلٰی هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔

(سورۃ النسا: ۴۱) خلافت!

حاصل کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرض اصلی اور ارسالِ رسل کا مقصد عمومی ہے انسانوں پر اتمامِ حجت اور قطعِ عذر بذریعہ تبلیغ و دعوت، تلقین و نصیحت، وعظ و تذکیر اور انذار و تنبیہ جن کا مجموعی حاصل ہے "شہادت علی الناس"!

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ اولین۔
بھوائے آیتِ قرآنی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَ
سِرَاجًا مُنِيرًا
اے نبی! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا
کر گواہ اور بشارت دینے والا اور
خبردار کرنے والا اور بلانے والا
اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن

(سورۃ الاحزاب: ۴۵-۴۶) چراغ (ہدایت)۔

گو یا معلم و مبلغ، مربی و مرئی، مہبشر و منذر اور داعی و شاہد کی جملہ
حیثیتیں مشترک ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مجاہد انبیاء و رسل
علیہم السلام میں اگرچہ ان اعتبارات سے بھی عہد ہر گلے رنگ و
نوعے دیگر است! کہ مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد
رنگ بھی ہے، اور اس گلہ سے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند
بالا مقام ہے سید الاولین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مقام
بحیثیت خاتم النبیین و آخر المرسلین جن پر نبوت و رسالت کا اختتام
ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ آپ کے مقصد بعثت کی
امتیازی شان کچھ اور ہی ہے جس کا بیان آگے آئیگا!

بعثتِ محمدیؐ

عَلَيْهِمُ السَّلَامُ

کی اتمامی و تکمیلی شان

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظِ قرآنِ حکیم میں تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شو شے کا بھی فرق نہیں ہے جبکہ پورے قرآن مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور تالیف ”إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء“ میں مفصل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہر نوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے

۱۔ سورۃ التوبہ: ۳۳، سورۃ النسخ: ۲۸، اور سورۃ المصفا: ۹۔ ترجمہ: وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدی اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے کل دین پر۔

ان الفاظ مبارکہ پر غور و تدبیر لازمی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ایک ”الہدیٰ“ اور دوسرے ”دین حق“۔

”الہدیٰ“ کو وسیع لغوی مفہوم پر پرکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی لیکن

”الہدیٰ“

نظارہ قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے

تو وہ ہے ”قرآن حکیم“ اس لیے کہ وہی ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ بھی ہے اور ”هُدًى لِّلنَّاسِ“

بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ ”وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا هَدًى يَّبْهِي

مَنْ كَشَاءَ مِنْ عِبَادِنَا“ اور یہ بھی کہ ”إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هِيَ أَقْوَمُ“ اور وہی

ہے کہ جسے جہنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اُٹھے کہ ”إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا

يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ“

مزید برآں سورۃ الحکیم کی آیت ۲۵ میں ”ارسال رُسل“ کے ضمن میں فرمایا کہ:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا

بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُم

تعلیمات اور روشن نشانوں

۱۔ سورۃ البقرہ: آیت ۲ ”ہدایت پر ہمیز گاروں کے لیے“۔

۲۔ سورۃ البقرہ: آیت ۱۸۵ ”ہدایت پوری نوعِ انسانی کے لیے“۔

۳۔ سورۃ الشوریٰ: آیت ۵۲ ”لیکن بنا دیا ہم نے اُسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے لیے

چھ چاہیں اپنے بندوں میں سے“

۴۔ سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۹ ”یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے“۔

۵۔ سورۃ الحج: آیت ۲-۱ ”ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف“

تو ہم ایمان لے آئے اُس پر“۔

الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ-

کے ساتھ اور آثاری اُن کے ساتھ

کتاب اور میزان-

ظاہر ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں جس طرح ”الْمِيزَانُ“ کو ”دینِ الْحَقِّ“ کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ”الْكِتَابُ“ ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیہ زیر بحث میں ”الْهُدٰی“ کا لفظ آیا ہے۔ گویا ”الْهُدٰی“ سے مراد بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے ”الْقُرْآنِ“ کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحديد ”اَقْرَأِ الْمُسْتَحَاتِ“ کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ الصّٰفّٰہ جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیر بحث الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں)۔

”دینِ الْحَقِّ“ اسی طرح ”دینِ الْحَقِّ“ کو بھی خواہ ظاہری ترکیب اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے ”حق کا دین“ خواہ اُسے ترکیبِ توصیفی شکل ترکیب اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے ”سچا دین“ (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہر صورت ایک ہی ہیں یعنی ”اللہ کا دین“ اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری بھانڈ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ لہٰذا اُن آیتِ قرآنی:

۱- ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ

یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے

(سورۃ الحج: ۶۰، ۶۱)

”حق“۔ (یعنی کامل حق یا مبرا حق)

۲- وَیَعْلَمُونَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ

اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ

(سورۃ النور: ۲۵)

ہی ہے کھلا ”حق“۔

گویا ”دینِ الْحَقِّ“ بالکل مساوی و مترادف ہے ”دینِ اللہ“ کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیتِ زیر بحث کے ضمن میں دینِ الْحَقِّ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے

اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ دین اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں! لفظ ”دین“ پر توجہ کو مرکوز کیجئے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ ”اساسُ القلن“ یعنی سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ (جو لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہو گا اور بدی کا سزا کی شکل میں)

چنانچہ قرآن مجیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزا و سزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

۱- اَذَیْتُ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالْذِّیْنِ- تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا

(سورۃ الماعون: ۱) و سزا کو

۲- فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدَ الْذِّیْنِ- تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے

(سورۃ التین: ۷) تجھے جزا و سزا کے جھٹلانے پر

۳- کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُونَ بِالذِّیْنِ- کوئی نہیں، بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و

(سورۃ الانفطار: ۹) سزا کو!

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ ”یوم“ کی اضافت کے

۱- سورۃ آل عمران: آیت ۸۳، سورۃ النور: آیت ۲، سورۃ النصر: آیت ۲۔

۲- یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت ”کَمَا تَدِیْنُ تَدَانُ“ (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوان حماس کے مشہور مصرع کے الفاظ ”وَدَنَا هُمْ کَمَا دَاخُوا“ (ہم نے اُن کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا، بھی ذہن میں مستحضر کر لیں اور اسے بھی کد عربی میں ’ذین‘ کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹا یا جانا لازم ہوتا ہے۔

۳- جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”فَعَلْتُ جَدًّا وَنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالسُّوءِ سُوًّا“ (پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور بُرائی کا بُرا!)

ساتھ یوم قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزاء و سزا کا دن !
 پھر چونکہ بدلے اور جزاء و سزا کا تصور لازماً متکثر ہے کسی قانون اور ضابطے
 اس کی اطاعت و متابعت کے تصور کو، لہذا لفظ 'دین' نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس
 سے اٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اولاً اطاعت کا مفہوم پیدا ہوا۔
 چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ "مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ" اور ایک بار "مُخْلِصًا لَهُ دِينِي" اور چوتھے
 "مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے
 خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آتے ہیں جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں
 اضافہ کیا جاتا ہے "خَفِيفًا" یا "حَنِيفًا" کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان
 الفاظ مبارکہ کا کہ: "إِلَّا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" (سورۃ الزمر: ۳) اور "وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا" (سورۃ النحل: ۵۲)
 — اور بالآخر اس نے نظام اطاعت کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی اضافت حقیقی تو اس
 ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظام زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا
 گیا ہو جیسے سورۃ یوسف میں فرمایا:

كَذَلِكَ يَدْنَا لِيُوسُفَ ط مَا
 كَانَ لِيَا خُذَ أَخَاهُ فِي
 دِينِ الْمَلِكِ۔
 اس طرح ہم نے تدبیر کر دی
 یوسفؑ کے لیے ورنہ بادشاہ کے
 قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے

(سورۃ یوسف: آیت ۷۶) بھائی کو روک سکتے۔

گویا مصر کے اس دور کے رائج اوقات نظام ملکیت کو جس میں مطاع مطلق کی حیثیت
 بادشاہ یا 'ملک' کو حاصل تھی قرآن حکیم "دین الملک" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ٹھیک
 اسی مفہوم (SENSE) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں "دینِ اللہ" کے
 الفاظ سورۃ النصر میں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ
 جب آگئی اللہ کی مدد اور فتح

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ
فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا
اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے
ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ اللہ ہی کو مطاع مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظام اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے ”دین اللہ“ کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دور جدید کے محبوب و مقبول طرز حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح ہر حال نظری طور پر حاکمیت کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں جمہور تعبیر کیا جائے ”دین الجہود“ کے الفاظ سے،

البتہ قرآن حکیم میں ”دین“ کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافت مجازی قرار دیا جانا چاہیے جیسے ”دینی“ یا ”دینکم“ یا ”دینہم“۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظام اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا ”اس کا دین“ بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس شہو دُعَا کے الفاظ میں: اللَّهُمَّ انصُرْ مَنْ نَصَرَ دِينَ مُحَمَّدٍ.... الخ اسلام اصلاً تو دین اللہ ہے لیکن مجازاً دین محمد بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فَنَدَاهُ آبَاءَنَا وَاقْرَءَهَا نُنَا۔)

حاصل کلام یہ کہ ”دین الحق“ سے مراد ہے ”دین اللہ“ یعنی وہ نظام زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ دراصل قائم النبیین و آخر المرسلین

لہ بقول علامہ اقبال مرحوم

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھا ہے یہ آزادی کی ہے نلم پری!

صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس "الْمِيزَان" کی جوتاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو "عَلَى نَبِينَا وَعَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَام" اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس 'نظام عدل اجتماعی' کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظام قسط پر۔

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

ہے کہ ختم نبوت اتمام نبوت شریعت اور تکمیل دین حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمت الہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسل انسانی کو یا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچتی تھی، ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی بچگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسل انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مضور جنہوں نے مذاہب عالم، فلسفہ، تصوف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سوسال یعنی چھ سوسال قبل مسیح سے چھ سوسال بعد مسیح تک کا عرصہ فجر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی بچگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آچکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرورت ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے

لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعہ نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقتاً جدید محنتِ فکر یا مدرستہ فلسفہ۔ اور فلسفہ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتیبِ فکر سامنے آئے ہیں اُن کی حیثیت نئی باتوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھیں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ”نوع انساں“ را پیام آفریں؛ یعنی قرآن حکیم ”المہدیٰ“ بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اُس کی ابدال آباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوع انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلْسَبِیْ
یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ

ہی اَقْوَمُ (سورۃ الاسراء: ۹)
کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔

۲۔ وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ
اور اس (قرآن) کو ہم نے سچی ہی

وَ بِالْحَقِّ نَزَّلَ ط
کے ساتھ نازل فرمایا۔ اور سچی ہی

(سورۃ الاسراء: ۱۰۵)
کے ساتھ وہ نازل ہوا۔

۳۔ قُلْ لِّیْنَ اَجْمَعَتْ الْاِنْسُ
کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انساں

وَالْجِنَّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ
اور تمام جن اس پر کہ لے

هٰذَا الْقُرْاٰنِ (اَوْ یَاْتُوْنَ
آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لاپائیں

بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک

لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝
دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی

(سورۃ الاسراء: ۸۸)
بن جائیں۔

اور اُس نے پوری نوع انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا
اور اگر ہو تم شک میں اس

نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتَوْا
بِسُودَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ۔
کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم
نے اپنے بندے پر تو لے آؤں

(سورة البقرة: ۲۳) جیسی ایک ہی سورة !

افسوس کہ تاحال قرآن حکیم کے وجوہ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اُس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت، تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوتی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں یاں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بیٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اُس کے قدموں میں ڈال دی گئیں درآں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناچختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً ”الْهُدٰی“ ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی ’فکری و عملی رہنمائی‘ ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکر انسانی بطور خود (AS SUCH) اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے ’بالغ‘ ہو گیا تھا!

۲۔ آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دو ٹوٹا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی نچتہ ہو چکا تھا اور انسان کی اہمیت اجتماعی بھی ارتقار کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اولاً قبائلی زندگی اور اُس کے بعد شہری ریاستوں (CITY STATES) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیات انسانی پر نظام اجتماعی کی گرفت پوری شدت کو پہنچ چکی تھی، اور انسان کو تمدن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابلے پیش آچکا تھا۔ مزید برآں اب اُس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں

فرد بمقابلہ جماعت، مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاپختل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالم انسانیت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور TO BE OR NOT TO BE کی سی اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا۔ لہذا یہی مزدوروں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظام عدل اجتماعی عطا کر دیا جائے جو واقعہ ”الْمِيزَان“ کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہ وسط کا تعین کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سوائے اسبیل کو پوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی (SOCIAL PERVERSION) کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال

(ECONOMIC EXPLOITATION) کا اور نہ سیاسی جبر (POLITICAL REPRESSION)

کا۔ اور ارسالِ رسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا یعنی ”لَيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ“ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابد الابد تک کے لیے پورا ہو جائے، لہذا آیت قرآنی:

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ

وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ

رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

لے تمہارے لیے دین اسلام کو۔ (سورۃ المائدہ: ۳)

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور لِيُظْهِرَ، پر غور فرمائیے۔ تو بحمد اللہ یہاں اظہار کے معنی تو متیقن علیہ ہیں یعنی ”غالب کر دینا، البتہ

یہاں فعل اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں موجود ہیں اگرچہ اُن سے مراد معنی میں کوئی سختی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعل اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعل ارسال کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور دوسری (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رائے یہ ہے کہ 'يُظْهِرُ' میں ضمیر فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دور جانا صحیح نہیں، الا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالم واقعہ میں قرآن مجسم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں۔ اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہار دین حق کے لیے عالم واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شہید محنت و مشقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی اگرچہ فاعل حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے۔
 بفحوائے آیت قرآنی:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ
 قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ
 رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ
 تو انہیں (کفار قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ
 اللہ نے کیا اور (انہی) جب تم نے ان پر
 خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ شہید خاک
 بلکہ اللہ نے پھینکی تھی!)

(سورة الانفال: ۱۷)

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصور ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعم خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضہ اظہار دین حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوہ بدر کے بعد جب آیت مذکورہ

حاشیہ صفحہ گذشتہ

لہ 'ظہر' کہتے ہیں پیٹھ کو۔ اور ظاہر استعارۃً غالب کے معنی میں بھی استعمال ہے جیسے قرآن مجید میں سورة الصف کے آفریقہ "فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ" (پس وہی ہوئے غالب) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے! 'اِظْهَارُ' باب افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعل متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

بالا نازل ہوئی اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی و جہد سے شکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رُخ بہتا؟ اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولت ایمان اور نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہیے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آگئے؟ اور صور حال وہ تو نہیں جو ”غوتے بدر بہانہ بسیار“ کی کہاوت میں بیان ہوئی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ:۔

بیتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!
 اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف جن میں آیت زیر بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں خصوصاً سورۃ الصف تو از اول تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیہ مبارکہ یعنی: **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَكُ وَكِرَہُ الشُّرُكُونَ** کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبہ جہاد و قتال کو لٹکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذاب جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں؟ اور پھر صاف صاف سنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کھٹن اور پرمعصوبت وادلوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ	اے اہل ایمان! کیا میں رہنمائی
مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ تَقْضُونَهَا	کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ	جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ	سے؟ ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے
	رسول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور

وَأَنْفُسُكُمْ (سورة الصف : ۱۱۰)

کھپاؤ اس میں اپنے ال بھی اور اپنی جانیں بھی۔

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی، 'اُخروی فوز و فلاح' کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرتِ خدا و رسولؐ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی۔ — بصورتِ دیگر یہ مقامات بلند تو خارج از بحث ہیں ہی عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ مہوم کے سوا کچھ نہیں !

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دینِ اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں اُن کے خلوص، اخلاص کا اصل امتحان (TEST) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسولؐ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد !!

چنانچہ سورۃ الاحد کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرمادی :

وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ
وَرَسُولُهُ بِالْغَيْبِ ط

اور تاکہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے
اُس کی اور اس کے رسولوں کی غیب کے باوجود

اور سورۃ الصف کا اختتام بھی ہوا اس آیتِ مبارکہ پر !

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا
أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى
ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ
أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ط

اے اہل ایمان ! بنو مددگار اللہ کے
جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے
حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار
اللہ کی طرف !

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔

يُطِيعُہُ کی ضمیرِ فعلی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں : ایک یہ کہ اس کا مرجع

ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجح ہے رسولؐ کی جانب۔ اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسولؐ کے غلبے کا مطلب بھی اُن کی ذات یا اُن کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دین حق ہی کا غلبہ ہے۔

علی الدین کُلّہ ”علی الدین کُلّہ“ کا ترجمہ اکثر و بیشتر ترجمین نے ”تمام ادیان پر“ کیا ہے۔ گویا ”الدین“ کے

لام تعریف کو لام استغراق قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں جس قدر امکان لام استغراق کا ہے اتنا ہی لام جنس کا بھی ہے، چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ ”سب دین پر“ یا ”سارے دین پر“ یا ”کُل دین پر“ یا ”پورے جنس دین پر“ بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اولین اُردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جلیل القدر صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایت لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر و بیشتر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تو اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبدالقادرؒ ہی کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اُردو کے محاورے میں جو تبدیلی آگئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ”علی الدین کُلّہ“ کا ترجمہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں تو ”ہر دین سے“ کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصف میں ”دینوں سے“ سب سے“ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التوبہ میں ”اوپر دین سب کے“ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصف دونوں مقامات پر ”اوپر دین سارے کے“ کی تعبیر اختیار کی ہے۔

گویا جہاں تک ٹھیکہ عربی قواعد کا تعلق ہے یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں، البتہ اگر حسب ذیل حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تراور موزوں ترجمہ شاہ رفیع الدین ہی کا ہے:

۱- پورے قرآن مجید میں نہ کہیں 'ادیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے، نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں 'الدین' کا ترجمہ "تمام ادیان" کرنا ممکن ہو۔

۲- تفسیر قرآن کے اہم اصول "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کے پیش نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے کہ "الدین" کے ساتھ "کَلِمَہ" کا تائیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسب ذیل آیت مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ

فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ كَلِمَةً لِلَّهِ

کافتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل
(سورۃ الانفال: ۳۹) کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔

اور یہاں ظاہر ہے کہ "سارے ادیان" کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی "پورے کا پورا دین" یا "سارے کا سارا دین" اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل "مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" اور "أَلِلَّهِ الدِّينَ الْخَالِصُ" اور "وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا" کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب "الدین" کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا ترجمہ کیجئے تو وہ یوں ہوگا:

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الہدای' (یعنی قرآن حکیم)، اور دینِ حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کُلّی کے اصول پر مبنی نظام زندگی

یعنی اسلام کے ساتھ تاکہ غالب کر دے وہ (یعنی رسولؐ) اُسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظام اطاعت یا نظام زندگی) پر! اس آیت مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اُظہارِ دینِ الحَقِّ عَلَی الدِّینِ مِلَّہ کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اُظہارِ دین حق، دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لا بُدّی تھا:

۱۔ ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظام اطاعت بے معنی ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سافرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جبروی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گزارہ کر سکتا ہے۔ جس طرح غلبہ اسلام کے زمانے میں عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت یا بدھ مت اور ہندو مت ایسے مذاہب ”يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ“ کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبہ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا۔ جب کہ دین ایک مکمل حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت یا کیپٹلزم اور کمیونزم کسی خطہ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی

لے التوبة: ۲۹۔ ”دیتے ہوئے جزیرہ اپنے ہاتھ سے چھوٹے ہو کر!“

لے جس کی صحیح ترین تصویر ہے علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں

”ملا کو جو ہے ہند میں بجدے کی جاڑ“ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزادا

جگہ ہم سر اور ہم بدلہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے مابین مفاہمت (DETENTE) یا پُر امن بقائے باہمی (PEACEFUL CO-EXISTENCE) کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں حقیقتیں اور بھی پیش نظر رہنی چاہئیں: ایک یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیث نبویؐ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکھ کے لیے جیسے مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی اور مذہب اہل حدیث جن کی حیثیت دین اسلام کے اصل شجرہ ثابۃ کی فروغ اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعت موسویؑ اور شریعت محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضرتؐ جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی تھا، لہذا آیت قرآنی:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا
مَقَرَّ كَيْفَ اسَّ اللَّهُ نَبِيَّاهُ لِيُؤْمِنُوا بِهِ

۱۔ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیسکراں ہے زندگی!! (اقبال)

۲۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۃ التوبہ کی محولہ بالا آیت کے الفاظ ”وَهُمْ صَاغِرُونَ“ کا مفہوم پوری طرح سمجھ کر سامنے آ جاتا ہے!

إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِمُ آبَاؤَهُمْ
نُوحٌ كُوَادُ جُوحِي كَيَا هُمْ نَ (لئے نبیؑ) تہا ہری
طُفْ اُور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ
وَمُوسَى وَعِيسَى -

(سورۃ الشوریٰ: آیت ۱۳) اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'اظہار دین الحق علی الدین کلہ' اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظام اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کر نہ دکھا دیا جائے پس ایک خیالی جنت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور رسالت محمدؐ کی جانب سے نوع انسانی پر "شہادت" اور "اتمام حجت" اور قطع عذر (جو سلسلہ رسالت کی غرض اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپ اس دین حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے 'علیہ دین حق' کی صورت میں وہ 'نظام عدل اجتماعی' بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا۔ جو بعد میں خلافت راشدہ کے دوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران نوع انسانی کے سامنے یہ 'معجزات' عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ "انسانی حریت"، انخوت اور مساوات "صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کاروبار بھی دھار سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ نظام عالمی میں مرد کی قوامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جاسکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظام سیاسی میں کامل آزادی رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جاسکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجہ پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظام معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبہ محرک کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔

تو اُس دور کے انسان پر دینِ حق کی جانب سے ”تمام محبت“ کیسے ہو سکتا جس کے فاسخ ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے تمام و کمال اور بغایت توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری دہنی تہمت دو اور عملی جھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدی تک رسائی کی سعی و کوشش ہے، بقول علامہ اقبال:۔

حاشیہ صفحہ گذشتہ

۱۔ ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. WELLS) کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو غرضِ عداوت ہے وہ اُن کی ایک محلوں سے ظاہر ہے جو اُس نے آنحضور کی ذاتی اور خصوصاً فاعلی زندگی پر کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A CONCISE HISTORY OF THE WORLD) میں تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ”انسانی تہذیب“ اخوت اور مساوات کے دعوے تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے۔ چنانچہ مسیحِ ماری کے یہاں بھی اُن کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار اِن اصولوں پر مبنی نظامِ عمل قائم کر کے دکھادیا محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہادت کی کہ ”الفضل ما شہدت بہ الاعداء“ (اہل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پاتے) چنانچہ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو دہاتا (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے مونے کے ٹکڑے پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا دورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ رامائن اور مہابھارت یا کرماجیت یا چندرگپت موریہ کا!)۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ انجانی مومن داس کرم چند گاندھی نے اپنے رسالے ”ہریجن“ میں ۱۹۳۷ء میں اس وقت لکھے تھے جب برطانوی ہند میں پہلی بار صوبائی وزارتیں بنی تھیں اور چونکہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات کا مقاطعہ کیا تھا لہذا پورے ہندوستان میں کانگریس ہی نے وزارتیں بنائی تھیں!

ہر کجا بینی جهان رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نور مصطفیٰ اورا بہاست یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین اور ختم و اکمال نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپ انداز و تبشیر، دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پرستزادِ عظیم، ہجرت، جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے باطل نظام زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ دین حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظام اطاعتِ خداوندی کو پورے نظام اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے

آپ انبیاء و رسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی داعیِ انقلاب

داعی انقلاب

کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے، لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ داعیِ انقلاب کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر تمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہیں! اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور اُن سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہوتی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور بنیّتِ حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اُس سے پوری انسانی زندگی

میں تبدیلی رونا ہوتی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر

نہ رہا۔

انقلابی جدوجہد

رہی آپ کی انقلابی جدوجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں

ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت و جہاد و قتال کی تمام منازل سے گذار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیرُالحوال کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ نے ایک فرد واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری) کی مختصر سی مدت میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلی اللہ علیہ وسلم وفداہ اباہ نا و امہاتنا!

نبوی طریق کار

رہا یہ سوال کہ عظیم تبدیلی کیسے رونا ہوتی اور انقلابِ محمدیؐ کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپ کی انقلابی جدوجہد کن کن مراحل سے گذری؟ تو یہ جانے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہوگی!

سرِ دست موضوعِ زیرِ بحث کی مناسبت سے دو مزید امور کی نشاندہی مطلوب ہے:

۱۔ مغربی مفکرین کی نا سمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث

سخت ٹھوکریں کھاتی ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے فہم میں مغربی مفکرین یا مُستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رُسل کی اساسی غرض و نغایت تو ہے، چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلغ بھی، معلّم بھی

ہوتے ہیں اور مرتی و مزکی بھی، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی، واعظ بھی ہوتے ہیں اور
 ناصح بھی، ریفارمر (REFORMER) بھی ہوتے ہیں اور مُصلح بھی لیکن چونکہ اُن پر ختم نبوت اور
 تکمیل رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہذا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی
 نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ عِلْم بھی، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے
 اور مدبر و سیاستدان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضورؐ کی شخصیتِ مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو
 دیکھتے ہیں تو سخت غلبان میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ اُن میں سے کوئی تو آپؐ کو نبی یا
 رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپؐ کی عظمت صرف بطور انسان تسلیم کر کے
 رہ جاتا ہے، کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ ”محمدؐ بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے البتہ
 بحیثیت مدبر و سیاستدان کامیاب ہو گئے“ اور کوئی آپؐ کی شخصیت کو دو مستقل حصوں میں
 منقسم کر بیٹھتا ہے، چنانچہ اُسے ”مکے والا محمدؐ“ اور نظر آتا ہے اور ”مدینے والا“ اور اَفْلَحَنَہُ
 اللہ علی الجاہلین!

۱ جیسے پروفیسر منگمری واٹ کے الفاظ:

ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM

یا جیسے ڈاکٹر مانکل ہارٹ کے الفاظ:

THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMEY SUCCESSFUL
 ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

۲ جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا:

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS
 A STATESMAN

۳ جو وہم پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف

کر کے ایک MOHAMMAD AT MECCA

اور دوسری MOHAMMAD AT MEDINA

۲۔ اُمت کا فرض منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے بہ تمام و کمال

ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندہ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورت واقعہ یہ ہے کہ

”وقت فرصت کبھی کام ابھی باقی ہے نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!“
تو کیا اُمت صرف عید میلاد النبی مناکر یا جلے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرض منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور صورت حال واقعہ یہ ہے کہ
”وائے کامی مستیع کار وں جاتا رہا“
کار وں دل آسناں زیاں جاتا رہا!

تاہم

اک طرزِ تغافل مسودہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تنابہ سو ہم کرتے ہیں گئے!
کے مصداق گزارش ہے — کہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختم نبوت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء و رسل کیا کرتے تھے آپ کے بعد اب وہ سب کے سب آپ کی اُمت کے ذمے ہیں۔ گویا خواہ دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ پر مثل فریضہ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء و رسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے خواہ اعلاء کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلمہ پر مثل بعثتِ محمدیؐ کا مقصد امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو، مجملہ اہل ارض اور جمیع کثرۃ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضورؐ کے نام لیا ہیں اور آپ کے نام نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپ کی اُمت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا

”الْأَهْلَ بَلَّغْتُ“ کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ: فَشَهِدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ
وَأَدَيْتَ وَنَصَحْتَ! آپ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے،
إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ!

آپ کے بعد آپ کی بعثتِ عامہ کی مجملہ ذمہ داریاں اُمت کے کاندھوں پر آگئیں
لِفُجَاءَةِ آيَةِ قُرْآنِي: لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپ کے حقیقی جانشین تھے، خلافت
راشدہ کے دوران جو واقعہٴ خلافت علیٰ منہاج النبوة تھی، آپ کی جانب سے تبلیغِ دین
’شہادت علی الناس‘، ’اقامتِ دین‘ اور ’اظہارِ دین حق علی الدینِ کلمہ‘ کے فرائض ادا کیے اور
تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت
بڑے حصے پر لہا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری
رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دین حق جو پورے رُوتے ارضی
پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا ”غریب الغریب“ بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف
حسین حالی مرحومؒ

اے خاصۂ خاصانِ رُسلِ وقتِ دعا ہے اُمتِ پتری اکے عجب وقتِ پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شانِ ستمگلاتھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغریب ہے!

اور

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ اُمجھرنا دیکھے!

۱۔ میں نے (آپ لوگوں تک پیغامِ الہی) پہنچا دیا یا نہیں؟

۲۔ ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ بھی فرمادی امانت بھی ادا فرمادی اور (ہماری) خیر خواہی کا حق بھی ادا فرمادیا!

مانے نہ کبھی کہ یہ ہے ہر صبر کے بعد دریا کا ہمارے جوا تر نادیکھے!
 الغرض آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر اُمتِ محمد علی
 صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے فرض منصوبی کو پہچانے اور اس سے عہدہ برآ ہونے
 کے لیے ایک عزم نو کے ساتھ کمر بستہ ہو جائے، تاکہ بعثتِ محمدی کا مقصد تمام و کمال پورا
 ہو اور پورے کُرتۂ انبی پر دینِ محمدؐ کا پرچم لہرا اُٹھے۔

کی محمدؐ سے وفاتوں نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیرہ ہے کیا لوحِ قلم تیرے ہیں
 اللَّهُمَّ انصُرْ مَنْ نَصَرَدَيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ
 وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِينَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ
 ————— آمِنْ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ! —————

انقلابِ نبویؐ

کا اساسی منہاج

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیان انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپؐ کی تحقیر و توہین ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ داعی انقلاب ”کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بہ تمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب مجزوی تھے اور ان کے نتیجے میں حیات انسانی کے صرف کسی ایک ہی گوشے میں تبدیلی رونما ہوتی۔ جیسے انقلابِ فرانس سے نظام سیاست و حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظام معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرمؐ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیات انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

مزید برآں اس اعتبار سے بھی نسل انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فخر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا

ہو، پھر یہی مراحل بھی خود ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو شکست اور تصادم کے جملہ مراحل سے گزار کر خود ہی کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ انقلاب فرانس اُس فکر کے نتیجے میں رونما ہوا جو ولٹیئر اور روسوائے میسوں مصنفوں کی تالیفات کے ذریعے تخلیق پایا اور پھیلا۔ لیکن انقلاب عملاً کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں برپا ہوا اور اس کی بالفعل رہنمائی میں ان مفکرین کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح انقلاب روس کی اساس اس فکر پر قائم ہوئی جو مارکس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”داس کپٹیل“ کے ذریعے پیش کیا لیکن خود مارکس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان پیدا نہ ہو سکا۔ اگرچہ بعد میں ایک فعال شخص لینن نے اس فکر کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا۔۔۔۔۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت محیر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرمؐ کا کہ آپ نے ایک فرد واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس میں اور وہ بھی شمشہی نہیں قمری، انقلاب اسلامی کی تکمیل فرمادی اور ایک وسیع و عریض خطے پر دین حق کو اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔ فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وسلم تسلیماً کثیرا کثیرا وفداۃ اباۃ ناو ائمہ اتنا!

ایک فرد واحد کی مختصر سی زندگی کے بائیس سالوں میں تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب کے از ابتدا تا انتہاء جملہ مراحل طے پا جانے کا نتیجہ نکالا کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی تیز اور انقلابی عمل کا زور (TEMPO) اتنا شدید نظر آتا ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے میں بالعموم نگاہیں صرف تصادم و کشش کے مختلف مراحل و مظاہر میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور جس طرح کسی زور شور سے بہنے والی پہاڑی ندی کو دیکھتے ہوئے انسان بالعموم اس کی سطح کے ہیجان و اضطراب ہی سے مہموت سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اُس کی گہرائی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی اسے نہیں ملتا۔ اسی طرح انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج بھی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ چنانچہ اول اول تو سیرتِ مطہرہ سے

متعلق جو مواد جمع ہوا تھا، وہ تھا ہی سارے کا سارا نمازی پر مشتمل۔ تاحال بھی سیرتِ مبارکہ کے مطالعے میں اصل تو جو مرکز رہتی ہے ہجرت سے پہلے کی

PASSIVE RESISTANCE

پرجس کے اہم نقوش ہیں تمام مسلمانوں پر بالعموم اور غلاموں پر بالخصوص شدید ہیمنہ تشدد (PERSECUTION) ہجرت حبشہ، شعب بنی ہاشم، یوم طائف، فیصلہ قتلِ نبویؐ، محاصرہ کاشانہ نبوت، غار ثور اور تعاقبِ سراقہ ابن مالک — اور ہجرت کے بعد کے

اقدام اور ACTIVE RESISTANCE پرجس کے اہم اور نمایاں نشانات میں قریش کی معاشی ناکہ بندی، بدر، اُحد اور احزاب کا مسلح تصادم جس میں عارضی سادقہ ہوا صلح حدیبیہ سے جس کے ختم ہوتے ہی تصادم دو گونہ ہو گیا۔ یعنی اندرونِ عرب بھی جس کے اہم نقوش ہیں فتح خیبر، فتح مکہ اور غزوہ حنین اور بیرونِ عرب بھی جس کے نمایاں نشانات ہیں غزوہ موتہ اور سفر تبوک۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے اس حد درجہ سلیس لیکن نہایت پرمعنی شعر کے مصداق کہ
خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!
غور کرنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کی عظیم انقلابی جدوجہد کی تہہ میں کارفرما وہ اصل طریق کار اور اساسی منہج عمل کیا تھا جس کے ذریعے وہ مروان کارفرما ہوئے جنہوں نے آیہ قرآنی:

”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا“ اہل ایمان میں جو ان مرد ہیں جنہوں نے

معاہدہ کیا اللہ علیہ وسلم پورا کر دکھایا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا

مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ پیش کر کے سرزد ہو چکے اور وہ بھی ہیں جو

مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا منتظر ہیں کہ کب باری آئے اور وہ بھی اللہ

(سورۃ الاحزاب: ۲۳)

کی راہ میں مل کر ناکہ بکدوش ہو جائیں۔ بہر صورت انہوں نے اپنے موقف سے سرموبدلی نہیں کی۔

کے مصداق انقلابِ نبویؐ کے شجرہ طیبہ کو اپنے خون سے سینچنا اور اپنی ہڈیوں اور گوشت پوست

کی کھاد سے پروان چڑھایا ہے
بنکر دند خوش رہے بجاکِ دُخونِ غلطیدن خدا رحمت کند ایں شوقانِ پاکِ طینت را

قرآن حکیم کی چار اہم اصطلاحات

اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دہرایا کہ:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ

یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے

وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الْهُدَىٰ' اور

كُلِّهِ (سورة التوبة: ۳۲)

'دینِ حق' کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُس کو

سورة الفتح: ۲۸- اور سورة الصف: ۹۰

پورے کے پورے دین پر!

تو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے بھی چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پورے چار بار دہرایا — یعنی:

۱- تلاوتِ آیات، ۲- تزکیۂ نفوس، ۳- تعلیمِ کتاب اور ۴- تعلیمِ حکمت!

۱- چنانچہ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمعیلؑ کی دعائیں یہ الفاظ وارد ہوئے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ

اے رب ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا

فَرِيقًا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ط وَ

فرمانبردار بناتے رکھ اور ہماری نسل میں سے

لَا نَمَانَا سَيِّئًا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ

بھی ایک ایسی اُمت بر پاکیزہ جو تیری فرمانبردار

اَنْتَ الْمُتَوَّابُ الرَّحِيمُ ۵ رَبَّنَا

ہو۔ اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝
(سورة البقرة: ۱۲۸-۱۲۹)

طور پر لیتے۔ اور قبول فرما ہمارے تو یہ یقیناً تو توہ
قبول کرنے اور تم فرانے والا ہے۔ اور اے
رب ہمارے تو بے حد فرامیوان میں ان ہی
میں سے ایک رسول جو ان کو سناتے تیری
آیتیں اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی۔

اور تزکیہ کرے ان کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔

۲۔ پھر تین ہی رکوعوں کے بعد اٹھارویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ
الْمُحْضَرِّ لِبَعَثِ دَرَجَاتٍ اِسْمِ اِبْرَاهِيْمَ عَلٰی يَدَيْنَا وَعَلَيْهَا الصَّلٰوةُ
والسلام کا ظہور ہے ان ہی اصطلاحات اربعہ کو دہرایا گیا،

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا وَمِنْكُمْ
يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝
(سورة البقرة: ۱۵۱)

جنانچہ بھیج دیا ہے تم نے تم میں ایک رسول
تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات
اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں
کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمہیں
ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

۳۔ اگلی سورت یعنی سورة آل عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ
وارد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ
لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (سورة آل عمران: ۱۶۴)

اللہ نے احسان عظیم فرمایا ہے اہل ایمان
پر کہ اٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں
جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ
کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور
حکمت کی اور یقیناً تھے اس قبل گمراہی میں!

۴۔ آخری بار مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ میں آتا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ
رُسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝
وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا امیوں
میں ایک رسول ان ہی میں سے جو نانا
ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا
ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب
اور حکمت کی۔ یقیناً وہ تھے اس سے
قبل کھلی گمراہی میں! (سورۃ الجمعہ: ۲)

اور یہاں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۃ الجمعہ سے متصلاً قبل ہے سورۃ الصف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضورؐ کے مقصد بعثت کے انقلابی پہلو کو وضع کیا گیا ہے، یعنی:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ
گو یا آنحضورؐ کا مقصد بعثت ہے: 'اظہار دین حق علی الدین کلہ' اور اس
کے لیے آپؐ کا طریق کار اور منہج عمل ہے: تلاوت آیات، تزکیہ اور
تعلیم کتاب و حکمت!

اس مقام پر ذرا توقف کر کے ایک اہم حقیقت پر غور کر لینا
مقصد اور طریق کار
چاہیے اور وہ یہ کہ کسی بھی اہم کام کے لیے مقصد اور طریق کار
دونوں نہایت اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں آخری منزل پیش نظر رہتی
ہے اور طریق کار میں ہر مرحلے کے لوازم پر توجہ دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں
کا توازن ہی کسی کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن بن سکتا ہے اور شخص یا گروہ بیک
وقت ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے وہ اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی ایسی
مثالوں سے بھری ہوتی ہے اور خود ہمارے گرد و پیش بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت یا جماعت اپنے پیش نظر مقصود کے حصول کی عجلت میں درمیانی مراحل کو پھلانگ جانا چاہتی ہے اور کسی راہِ قصیر (SHORT CUT) کی دلدل میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا اور وہ راہِ قصیر اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ گویا وہ کبل کو چھوڑنا چاہے بھی تو کبل اُسے نہیں چھوڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے اپنے متوسلین کی ہمت یہ کہہ کر بندھانی جاتی رہے کہ: ع

”اُس موڑ سے اُگے منزل ہے، یلوں نہ ہو در آجا!“

اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ذریعے ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے اور راستے ہی کو منزل قرار دے لیتا ہے نتیجہ ساری توانائیاں ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اہل قافلہ وَهوَ يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعَهُ کے مصداق صرف حرکت اور اُس کی تیز رفتاری ہی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ اب اگر اس حقیقت سے فراز ممکن نہیں کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب طریق ہوتا

ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کار موزوں نہیں ہوتا تو جو لوگ خلافت علیٰ منہاج النبوة کے قیام کے خواہش مند ہوں اُن کے لیے لازمی ولایتی ہے کہ وہ غور کریں کہ آنحضور کا اصل منہج عمل کیا تھا۔ مبادا وہ بھی متذکرہ بالا افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جائیں!

اس ضمن میں کتنی پیاری ہے وہ بات جو امام مالکؒ نے فرمائی کہ لَا يَصْلَحُ اخْرَجَ هَذِهِ الْأُمَّةَ إِلَّا بِمَا صَلَّحَ بِهِمْ أَوْلَاهَا۔ اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی کایا پلٹ ہوتی تھی۔ اور کتنی حیرتناک ہے یہ حقیقت کہ دورِ نبویؐ سے اس قدر قُرب کے باوصف ائمہ دین کو کتنی فخر تھی اس آخری دور کی جس میں ہم جی رہے ہیں!

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کا یہ خیال

ہے کہ قرآن حکیم انقلاب اسلامی کے لیے کسی منہج عمل کی جانب رہنمائی نہیں کرتا تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ یہ قرآن مجید پر بھی ایک سنگین طعن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی حد درجہ ناروا وسوسہ طعن اس لیے کہ مسلمانوں پر خلافت علی منہاج النبوة کے قیام کی سعی کو مستقلاً فرض اور واجب کر دینا اس کے لیے کسی واضح طریق کار کی نشاندہی نہ کرنا صریح ظلم قرار پائے گا۔ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ! اصل بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو لفجوائے آیت قرآنی: "وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ" اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت کو پہچانا، نہ لفجوائے آیت مبارکہ: "أَفَلَا يَسْتَدْبِرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا" قرآن حکیم ہی پر غور کیا۔ بلکہ اسے: "بِنَدَ حَرِيقٍ مِّنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ كَتَبَ اللَّهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِمْ" کے مصداق پس پشت ڈال دیا اور صرف حصول والیصال ثواب کا آلہ بنا کر رکھ دیا۔

تو ہاں چند کلیوں کی قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

اب ذرا ان چار اصطلاحات پر توجہ مرکوز فرمائیے جن میں نبی اکرم کے اساسی منہج عمل کا بیان ہوا ہے تو سب سے نمایاں خصوصیت

مرکز و محور۔ قرآن حکیم

جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کا مرکز و محور خود قرآن حکیم ہے! اس لیے کہ ان میں سے پہلی اور تیسری یعنی تلاوت آیات اور تعلیم کتاب تو بالبداهت قرآن مجید ہی سے متعلق ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور چوتھی کا مدار بھی قرآن ہی پر ہے اس لیے کہ لفجوائے الفاظ قرآنی: "قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ" (لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراض قلبی کی شفا بھی) تزکیہ نفوس، تصفیہ قلوب اور تجلیہ باطن و حقیقت شمر ہے تلاوت آیات کا اور لفجوائے آیت قرآنی: "ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ" (یہ ہے

وہ حکمت جو تیرے رب نے تجھ پر وحی فرمائی، حکمت بھی مجھ کو لایفک ہے قرآن حکیم کا!
 گویا انقلابِ نبویؐ کا اسی منہج عمل پورے کا پورا گھومتا ہے
 قرآن مجید کے گرد، یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ آنحضورؐ
 کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم!

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں تو بیان کیا مولانا عالی نے کہ:
 اتر کر ہر اسے سوتے قوم آیا اور اک نسخہ کیسیاں تھلایا!
 اور حد درجہ پُر شکوہ الفاظ میں بیان فرمایا علامہ اقبالؒ نے کہ:۔

گر تو می خواہی مسلمان زلیتن نیست ممکن جز بقرآن زلیتن
 اں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت اولایزال است و قدیم
 فاش گویم آنچہ در دل مضمراست ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
 مثل سقی پنہاں وہم پیدا ست او زندہ و پائندہ و گویا ست او
 چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

گویا آنحضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ یہ تھا کہ قرآن حکیم: ”چوں بجاں در رفت!“ کے مصداق
 صحابہ کرامؓ کے باطن میں سرایت کر گیا اور اُن کے اذہان و قلوب اس کے نور سے منور ہو
 گئے۔ نتیجہً اُن کی زندگیوں میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ اُن کی سوچ بدل گئی، اُن کا فکر
 بدل گیا، اُن کے عقائد بدل گئے، اُن کی اقدار بدل گئیں، اُن کے عزائم بدل گئے، اُن کے
 مقاصد بدل گئے، اُن کی آرزوئیں بدل گئیں، اُن کی تمنائیں بدل گئیں، اُن کے دن بدل
 گئے، اُن کی راتیں بدل گئیں، اُن کی صبحیں بدل گئیں، اُن کی شاہیں بدل گئیں، اُن کی زمین
 بدل گئی، اُن کا آسمان بدل گیا، یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر
 ہو گئی! اور یہ ساری تبدیلی ثمرہ تھی ایک کتاب اور اُس کے علم و حکمت کا اور اس کے معلم اور
 اس کی تعلیم و تربیت کا۔ — فصلی اللہ علیہ وسلم! اسی لیے فرمایا آنحضورؐ

نے کہ: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) واضح رہنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کا اصل ایجابی اور مثبت عمل صرف اور صرف تلاوتِ آیات و ترکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت تھا۔ تصادم اور کشمکش کی ہر ساری صورتیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اصلاً مظہر ہیں اُس ردِ عمل کا ہر ایک غلط نظام و حکم و عمل کی جانب سے دعوتِ حق کے جواب میں پیش آنا لازمی ہے۔ تاہم اصل عمل اور ردِ عمل کے تدارک کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کے مابین فرق و امتیاز ذکر کرنا بڑی نا سمجھی ہے۔

کتابِ الہی اور اُس کے مُعَلِّم کی ذاتِ اقدس کی عظمت تو ظاہر ہے کہ بیان تو کجائیل و ادراک کی گرفت میں بھی نہیں آسکتی۔ موجودہ دور میں تو ایک عام انسان کی تصنیف کا یہ اعجاز نگاہوں کے سامنے ہے کہ روتے زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر جو نظام قائم ہے وہ سب اُس کے ظہور و بروز کے سوا اور کچھ نہیں غالباً اسی لیے کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے مارکس کے بارے میں کہ ع: "نیست پیغمبر و لیکن در غفل دارد کتاب!"

تلاوتِ آیات | اس اجمال کی تفصیل قرآن حکیم کے طول و عرض میں تانے بانے کے مانند سنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کارِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور فرائض دعوت و تبلیغ کے جتنے پہلو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن سب کا بیسی و مدار اور مرکز و محور خود قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں طوالت کے خوف کے باوجود چند اشارات ضروری ہیں:-

۱۔ قرآن حکیم کی رو سے انبیاء و رسل کے فرائض میں سب سے زیادہ اساسی فرضیہ اُندازِ تبشیر کا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں بہت سے انبیاء و رسل کا ذکر کر کے فرمایا گیا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (یہ حضرات) رسول بنا کر بھیجے گئے بشارت دینے

لِسَلَامٍ يُكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ
حُجَّةٌ مَّ بَعْدَ الرُّسُلِ ط
والے اور خبردار کرنے والے تاکہ ان کی
بعثت کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے
سامنے کوئی دلیل (عذر) نہ رہ سکے !
(سورۃ النساء : ۱۶۵)

سورۃ الکہف میں بطور کلیہ ارشاد فرمایا :
وَمَا أَرْسَلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا
مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (آیت : ۵۶)
اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر صرف مبشر
اور نذیر بنا کر !

اور سورۃ بنی اسرائیل میں تعین کے ساتھ آنحضورؐ کو خطاب کر کے فرمایا :
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَ
نَذِيرًا (آیت : ۱۰۵)
اور ہمیں بھیجا (اے نبیؐ) ہم نے آپ
کو مگر صرف مبشر اور نذیر بنا کر !
اب دیکھتے کہ از روئے قرآن اس انداز و تمثیل کا مبنی و مدار خود قرآن حکیم ہی ہے :-
سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا :

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي
هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ
الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ
لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا وَأَنَّ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا

بے شک یہ قرآن اُس راستے کی راہنمائی
کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان
والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں، اس
بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے
بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان
نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لیے ایک دردناک
عذاب تیار کر رکھا ہے !
(سورۃ بنی اسرائیل : ۹-۱۰)

سورۃ الکہف کا آغاز ان مبارک الفاظ سے ہوا :

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ
الْكِتَابَ وَلَعَلَّ يُبْعَلَّ لَهُ عِوَجًا
شکر کا سنوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے
بندے پر کتاب اتاری۔ اور اُس میں

اس نے کوئی کج بیج نہیں رکھا۔ بالکل ہموار
اور استوار تاکہ وہ اپنی جانب سے ٹھٹھلانے
والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے
اور ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال کر
رہے ہیں، اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ
اُن کے لیے بہت اچھا اجر ہے!

فَمَا تَلْمِزُوا بِأَنَّا شَدِيدُ الْعِقَابِ
لَدُنْهُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ
الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ
لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا

(سورۃ الکہف: ۱-۲)

اور سورۃ مریم کے اختتام پر فرمایا:

پس ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں
اس لیے اہل و سائر گار بنایا کہ تم اس کے
ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور
جھگڑا لڑنے والوں کو آگاہ ہی سنا دو۔

فَإِنَّمَا يَسْتَرْشِدُ بِلسَانِكَ
لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ
بِهِ قَوْمًا لَّدُنَّا

(سورۃ مریم: ۹۷)

سورۃ الانعام میں فرمایا:

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ
میں اس کے ذریعے سے تمہیں بھی خبردار
کر دوں اور اُن کو بھی جن تک یہ پہنچ جائے

وَأَوْحَىٰ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ
لَا تُنذِرُ كَعِبِيهِ وَمَنْ بَلَغَ

(سورۃ الانعام: ۱۹)

۲۔ فرائض نبوت کے ضمن میں قرآن حکیم کی دوسری اہم اصطلاح 'تذکیر' ہے۔ اس
ضمن میں اس سے قطع نظر کہ قرآن خود اپنے آپ کو جابجا الذکر، ذکر الہی اور تذکیر
قرار دیتا ہے۔ سورۃ ق کے آخر میں یہ صریح حکم بھی دے دیا گیا کہ:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِبِيدِ ۝

۳۔ اسی طرح فرائض رسالت کے ذیل میں قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح 'تبلیغ' ہے
چنانچہ اس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے تو اپنے نبیؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: بَلِّغْ مَا

مصدق غلط فہم، غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے۔ اور صحیح عمل کے لیے صحیح فکر لازمی و لا بدی ہے۔ گویا اگر کسی انسان کے فکر کی تطہیر ہو جائے اور فاسد خیالات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے تو غیر صالح اعمال اور ناقص عادات و اطوار آپ سے آپ پٹ جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے، اور اگر صحیح فکر کی جڑیں ذہن انسانی میں راسخ ہو جائیں تو اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (PHENOMENON) کو قرآن حکیم ”وَيَكْفُرُ عَنْهُمْ سَرَّابًا“ بھی قرار دیتا ہے اور ”يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ“ بھی۔ اور یہی قرآن حکیم کا اصل فلسفہ تزکیہ ہے یعنی یہ کہ تزکیہ نفس کے لیے اضافی اور مصنوعی تدابیر نہ ضروری ہیں نہ مفید مطلب۔ بلکہ تزکیہ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیر فکر کا اور وہ فطری ثمر ہے تلاوت آیات کا یہی وجہ ہے کہ حضرات ابراہیم و اسماعیل علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے تو اصطلاحات اربعین تزکیہ کا ذکر آخر میں کیا تھا لیکن قرآن مجید میں بقیتینوں مقامات پر اس کا ذکر تلاوت آیات کے فوراً و معاً بعد ہوا ہے!

تزکیہ نفس کے ضمن میں ایک دوسری حقیقت بلاشبہ یہ بھی ہے کہ انسانی شخصیت میں فکر اور عمل کے مابین ایک اور عنصر جذبات کا بھی ہے اور ویسے تو ان کی اہمیت ہر انسان کی زندگی میں مسلم ہے لیکن خصوصاً وہ لوگ جن کا شعور نچرہ نہیں ہوتا یا جو عقلاً بالغ نہیں ہوتے ان کی زندگیوں میں تو فیصلہ کن اہمیت ان ہی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن دعوت کی اساس صرف حکمت ہی پر نہیں رکھتا موعظت پر بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو موعظ حسنہ بھی قرار دیتا ہے اور ”شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ“ بھی! — اس لیے نظر

لہ سورة الفتح: ۵ ”اِنَّہٗ تَاکِدُ وَّرْکُدُے اُنْ سے اُنْ کی برائیاں!“

لہ سورة الفرقان: ۴۰ ”تبدیل کر دے گا اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے!“

میں دیکھیے کہ کس قدر افسوس ناک ہے وہ صورت حال جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان اشعار میں کھینچا ہے کہ :-

صوفی پشیمند پوش حال مست از شرابِ نغمہ قوال مست !
آتش از شعر عراقی درویش در نمی سازد بقرآن مجلس !

حالانکہ اگر جذبات کی جلا اور سوز و گداز کو کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو ان کا بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن مجید ہی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی ترجمہ قرآن میں اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُر تاثیر اشعار نقل کیے ہیں :-

سُنْتے سُنْتے نغمہ ہائے مَحْضِلِ بدعات کو کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہوئے کوہے
اُوں سوائے تمہیں وہ نغمہ شروع بھی پارہ جس کے لُحْنِ طور ہدی ہوئے کوہے
حیف گزشتہ اُس کی تیسرے ل پر کچھ نہ ہو کوہ جس سے خاشعاً مُتَصَدِّعاً ہوئے کوہے

اس ضمن میں ذرا غور فرمائیے اور داد دیجئے اس پر کہ نفسِ امارہ کی طوفاں خیز لویں اور ابلیسِ لعین کی دوسرا انداز لویں سے بچنے کے لیے کس قدر صحیح مشورہ دیا ہے علامہ اقبال مرحومؒ نے :-

کشتنِ ابلیس کارِ مَکَلِ است زانکہ اُوگم اندر اعماقِ دل است
خوشتراں باشد مسلانش کُنِی گشتہ شمشیرِ تراش کُنِی

آنحضورؐ کے طریقِ انقلاب میں تلاوتِ آیات اور تزکیہٴ نفوس کے بعد
تعلیمِ کتاب

۱۔ اُوئی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں ست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔

اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی مَحْضِل میں قرآن کا کیس گزرنے نہیں !

۲۔ شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا بلیغ نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں !

بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآنِ حکیم کی (حکمت و ہدایت) کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنالیا جائے !

اور نوادہی کی تعلیم اور احکام الہیہ کی تنفیذ سے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں لفظ کتاب کا اطلاق بالعموم شریعت کے قواعد و ضوابط پر ہوا ہے جیسے: **إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا** میں یا: **وَلَا تَعَزَّزُوا عَقْدَةَ الشَّكَاكِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ** میں اسی طرح قرآن مجید میں کسی شے کی فرضیت و مشروعیت کے لیے بھی ”کِتَب“ کا لفظ کثرت استعمال ہوا ہے جیسے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** — **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** — **كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ** — **زَيْنَالِمْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** — **وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنْ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ**۔

واضح رہنا چاہیے کہ تلاوت آیات اور ترکیب کے مراحل طے ہو جانے کے بعد ہی انسانی شخصیت کی زمین پورے طور پر تیار ہوتی ہے کہ اس میں شریعت کے اوامرو نوادہی اور احکام الہی کے بیج بونے جاتیں اور وہ پُر تقویٰ کی ایک لہلہاتی ہوتی کھیتی کی صورت اختیار کر لے بصورت دیگر فصل کا حصول درکنار بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے یہی سبب ہے اس کی کہ قرآن مجید کا کتاب والا حصہ یعنی اس کی وہ آیات و سورتیں جن میں حلال و حرام کے تفصیلی احکام بیان ہوتے ہیں اس وقت نازل ہوا جب پورے پندرہ سال کی محنت شاقہ کے نتیجے میں

- ۱۔ سورۃ النسا: ۳۳ بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرروقتوں میں۔
- ۲۔ سورۃ البقرہ: ۲۳۵ اے لوگو! وہ کرو شاکر کا یہاں تک کہ پہنچ جاتے حدت مقررہ اپنی انتہا کو۔
- ۳۔ سورۃ البقرہ: ۱۸۳ ”قرض کیا گیا تم پر روزہ“۔
- ۴۔ سورۃ البقرہ: ۲۱۶ ”قرض کی گئی تم پر لڑائی“۔
- ۵۔ سورۃ البقرہ: ۱۸۰ ”قرض کر دیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت“ بشرطیکہ چھوڑے محمد علیٰ ویت کرنا۔
- ۶۔ سورۃ النسا: ۷۷ ”اور کہنے لگے اے رب ہمارے، کیوں قرض کی تو نے ہم پر لڑائی“۔
- ۷۔ سورۃ النسا: ۶۶ ”اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کر د اپنی جان“۔

جس میں تمام تر تہجبات تلاوت آیات اور تزیکیے پر مشتمل رہی تھیں، ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جو ان احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب تھا اس کی سب نمایاں اور درخشاں مثال حرمت شراب کے معاملے میں ملتی ہے کہ اُدھر حکم نازل ہوا اُدھر شراب کے رتن توڑ ڈالے گئے اور پھر ان لوگوں نے کبھی شراب کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جن کی گھٹئی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور پوری پوری عمریں پٹنے اور پلانے میں گزری تھیں۔ اور اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوا اس دور میں امریکہ ایسے تعلیم یافتہ اور مہذب و تمدن ملک میں جہاں PROHIBITION ACT کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں اور ”چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“ کے آگے تمام سائنسی حقائق اور اعداد و شمار دھرے کے دھرے رہ گئے!

تعلیم حکمت | انقلاب نبوی کے اساسی مہاج کا نقطہ عروج (CLIMAX) ہے
 ’تعلیم حکمت‘ حکمت اصلاً عبارت ہے انسانی عقل اور شعور

کی پہنچ کی اُس سطح سے جہاں پہنچ کر احکام شریعت کے اسرار و رموز واضح ہو جاتے ہیں اور اُن کی حکیمانہ غرض و غایت منکشف ہو جاتی ہے۔ گویا احکام بے جان اور زبردستی کے ساتھ ٹھونسے ہوئے اوامر و نواہی نہیں رہتے بلکہ فکر و عمل کے ایک حد درجہ حکیمانہ نظام کے ایسے باہم دگر منظم مربوط اجزاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن میں نہایت حسین توازن و توافق موجود ہو۔ یاد ہو گا، یہی اصل موضوع ہے فاتح دور حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی شہرہ آفاق تالیف ”حُجَّةُ اللہِ الْبَالِغَةُ“ کا اور یہی ہے وہ جنس کیا ہے جسے قرآن حکیم ”خیر کثیر“ قرار دیتا ہے لغوائے آیت قرآنی: ”يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ“ (اور یہ بات بھی محض اتفاقی نہیں کہ ”خیر کثیر“ بھی نام ہے حضرت شاہ صاحب کی ایک حد درجہ پُر از حکمت تصنیف کا!) گویا حکمت کی تحصیل ہر انسان کے بس کا

روگ نہیں؛ بلکہ یہ تعلیم و تربیت نبویؐ کا وہ درجہ تخصّص ہے جس سے فیض یاب صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کے نفوس میں علم کی ایک پیاس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کے لیے ظواہر پر اکتفا ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ حقائق باطنی کی تحقیق و نقیض پر اسی طرح مجبور و مضطر ہو جاتے ہیں جس طرح مَجْهُو کا تحصیل غذا پر اور پیاسا تلاش آب پر — وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ! اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں!

اس ضمن میں بھی اس خیال سے کہ حکمت سے لازماً قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مراد ہے قرآن حکیم کے ساتھ ایک نادرۃً وغیرہ شوریٰ سونہن کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حکمت تو قرآن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے ہے، اس لیے بھی کہ اس کی ایک مستقل صفت ہی ”حکیم“ ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اُس کی شان یہ ہے کہ کِتَابٌ اَحْكَمَتْ اَيُّهُ شَيْءٌ فَصَلَتْ مِنْ لَدُنِّ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۝ مزید برآں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں مراعات بھی مذکور ہے کہ: ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنْ اَلْحِكْمَةِ ۝ اور اس سلسلے میں بھی خطا اٹھائیے اور وجد میں آئیے علامہ اقبال کے ان اشعار پر

اے کہ می نازی بہ قرآن حکیم! تا مجا در حجرہ با باشی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کنُ نکتہ شرع مبیں را فاش کنُ

افسوس ہے کہ ہمارے ارباب علم و فضل نے بہت کم توجہ دی قرآن حکیم کی ان اصطلاحات اربعہ پر جو قرآن مجید میں ایک نہ دو پورے چار مرتبہ دہرائی گئیں؛ حالانکہ بلا سبب تکرار بظاہر کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور نہ قرآن عظیم کے مُنزِل و مُرْسِل تبارک و تعالیٰ کے پاس ذخیرۃ الفاظ کی کمی تھی نہ عربی زبان کا دامن ہی اتنا تنگ تھا کہ ہر بار مختلف الفاظ نہ لاتے جاسکتے۔ اس اعادہ و تکرار کا سبب ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اگرچہ ویسے تو قرآن مجید

کا ہر لفظ غالب کے اس شعر کا مصداق کامل و اتم ہے کہ: ع
 گنجینہ معنی کاظم اس کو سمجھو جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے!
 لیکن ان اصطلاحات اربعہ کی حیثیت تو بالخصوص ایسی ہے کہ ان پر توہیات کو بالکل عذریہ ہو
 لفظ غالب چیدہ ام میخانہ! کے مصداق مریخ کر دیا جائے۔

الغرض! انقلابِ نبویؐ کے تکمیلی مراحل تو وہی ہیں جو ہر انقلاب
 میں پائے جانے لازمی ہیں یعنی دعوت و تنظیم، تصادم و کش مکش،
 ہجرت و انقطاع اور جہاد و قتال۔ لیکن اس کا اساسی منہاج مشتمل ہے
 تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت پر جس کا مرکز و محور ہے
 قرآن حکیم!

انفرادی تبدیلی
 اگر آپ کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی یہ انقلاب لانا چاہیں تو اس
 کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے آپ اس کے فکر کا جائزہ لیں اور تلاوتِ
 آیات کے ذریعے اس کے ذہن کو فاسد خیالات اور غلط نظریات سے اور اس کے قلب کو
 فاسد ارادوں اور غلط امنگوں اور خواہشات سے پاک کریں۔ اس کے فکری ایمان باللہ، ایمان
 بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی محکم اساسات پر از سر نو تعمیر کریں اور اس کے قلب کو نور ایمان
 سے منور کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر صالح اعمال اور غلط عادات و اطوار پت بھڑکے پتوں
 کی طرح خود بخود جھڑ جائیں گے۔ اور تب موزوں وقت آنے کا اس کا کہ شریعت کے اوامرو
 نواہی کی تلقین اسے کی جائے۔ گویا اس کے وجود پر شریعت کا نفاذ عمل میں آجائے۔ پھر
 اگر وہ صاحب استعداد ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر حکمت کی تحصیل کرے جس سے اصل انشراح
 صدر اور اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس کی شخصیت میں اس انقلاب
 کو تمکّن و استقلال بھی حاصل ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ہے وہ محنت و مشقت جس کا ثمرہ بیان ہوا
 ان خصوص کے اس جیگانہ قول میں جو آپ نے حضرت علیؓ سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ:

”لَنْ يَهْدِيَ اللَّهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا حَتَّىٰ لَكَ مِنْ حِمْلِ النَّعْمِ!“
 (اے علیؑ! اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے
 سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے!) اور اگر آپ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں
 تو آپ کی حالت وہی ہوگی جو ہمارے معاشرے میں ان بہت سے بڑے بوڑھوں کی ہوتی
 ہے جنہوں نے اپنی نوجوان نسل کو حوالے تو اس نظام تعلیم کے کیا ہے جس کے بارے میں
 غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ۛ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
 اور گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صد الا الہ الا اللہ
 نتیجہ کسی کے ذہن پر بڑی ریڈرسل سوا ہے اور کسی کے ساعت، کوئی فریڈ کا شیدائی ہے اور
 کوئی یونگ یا ایڈلر یا مکڈوگل کا کسی پر ڈارون کا جادو چلا ہوا ہے اور کسی پر ہیکل اور مارکس کا،
 چنانچہ خدا و آخرت اور وحی و رسالت پر ایمان و یقین کے آثار کا کوسوں پتہ نہیں لیکن تلقین ہو
 رہی ہے نماز اور روزے کی اور فرمائش و فہمائش ہو رہی ہے شعائر دینی کے احترام کے
 بارے میں، نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ نوجوان اگر نسبتاً شریف اور سعادتمند ہے
 تو نگاہیں نیچی کر لے اور آپ کی موجودگی میں احتراماً آپ کی خواہش بھی پوری کر دے لیکن اگر
 ذرا پبلیک اور جری ہو تو صاف کہہ دے کہ ”چھوڑیتے آبا جان ایہ سب ڈھکوسلے ہیں، جن کی
 کوئی حقیقت نہیں ہے!“

اجتماعی انقلاب

اس معاملے میں انسانی معاشرہ یا انسانی حیثیت اجتماعی ہے
 طرز عمل (BEHAVIOUR) بھی بالکل ایک فرد واحد کے

مانند ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں قوم کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جسے بالعموم ذہین اقلیت

یعنی INTELLIGENTSIA یا INTELLECTUAL MINORITY قرار دیا جاتا ہے اور جس کی حیثیت جسد اجتماعی میں بالکل وہی ہوتی
 BRAIN TRUST

ہے جو فرد واحد کے جسم میں اس کے دماغ کی۔ اگر کسی معاشرے میں اسلامی انقلاب لازماً طے ہو تو اولاً اُس کے اس طبقے کو APPEAL کرنا اور اُس کے قلوب و اذان کو نورِ ایمانی سے منور کرنا، گویا اسے اسلام کے حق میں بالفعل CONVERT کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے یا قوم کے دوسرے طبقات کی حیثیت، اعضاء و جوارح کی ہے جو قلب و ذہن کے بلے ام غلام ہوتے ہیں اور اُن سے صادر ہونے والے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہیں۔ جو لوگ کسی معاشرے یا قوم کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کیے بغیر خواہش مند ہوں کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی اسلام کو عملاً قبول کر لے، اُن کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ، اور نیک خواہشات اور تمناؤں اپنے مقام پر، لیکن امر واقعہ کے اعتبار سے اُن کی حالت بھی ان نیک مگر سادہ دل لوگوں سے کسی طرح مختلف نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرخسۂ قلبین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشیروا شاعت ہے

ہمارے اُمّت کے فہم عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک پھول جائے
اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ